باپو اور بچے

پی. ڈی. ٹنڈن

باپو اور بچے

پی. ڈی. ٹنڈن

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی- 110066

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	1979
چوتھی طباعت	:	2009
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/15 روپئے
سلسلۂ مطبوعات	:	911

Bapu aur Bachchey

by

P.D. Tandon

ISBN :978-81-7587-324-7

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔ 1، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون نمبر: 26103938، 26103381، 26179657، فیکس: 26108159

ای۔میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in

طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس آفسیٹ پرنٹرس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی۔ 110053

اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ

ڈائرکٹر

دیباچہ

"بچے میری زندگی ہیں"

باپو نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

اور اس ملک کے بچے ہماری قوم اور اس سرزمین کی جان ہیں۔

سچ پوچھو، تو ہندوستان کا مستقبل انھیں کے ہاتھوں میں ہے، ہمارا دیس ویسا ہی بنے گا جیسا ہمارے بچے اسے بنائیں گے۔

باپو ہمیشہ بچوں کا خیال رکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اگر ان کو ٹھیک راستے پر لگایا جائے تو ملک کا مستقبل بھی روشن ہوگا۔

وہ چاہتے تھے کہ ماں باپ بچوں کی دیکھ بھال اور پرورش اچھی طرح اور لگن سے کریں تاکہ وہ تندرست، اچھے اور سچے شہری بنیں۔

اس کتاب میں میں نے ایسی باتیں کہی ہیں جو بھی بچوں کو پسند ہیں اور ان سے باپو کو بھی خوشی ہوتی تھی۔ بچوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں ان کا دل چسپی لینا ان کی بڑائی کی نشانی تھی اور ان کی کہی ہوئی ہر بات ایک پیغام اور نصیحت ہوتی تھی۔

جب وہ بچوں کے ساتھ کھیلتے تھے یا ان سے ہنسی مذاق کرتے تھے تو اس سے بھی بچے کچھ نہ کچھ سیکھتے ہی تھے اور باپو تو بچوں کو بچہ بن کر ہی سکھاتے تھے۔ استاد کی طرح نہیں۔ اس وجہ سے بچے ان کے ساتھ ہنسی خوشی رہتے تھے اور کھیل کھیل میں اچھی اچھی باتیں سیکھ لیتے تھے۔

مجھے آج کے بچوں سے ہمدردی ہے کیونکہ آج وہ بڑے انسان ہم میں نہیں رہے میرا اشارہ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف ہے۔ یہ دونوں ہی بچوں سے بہت زیادہ پیار کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ بچوں کی آنے والی زندگی خوشیوں سے بھری ہوئی ہو۔

بڑے خوش قسمت تھے وہ بچے جنھوں نے گاندھی اور نہرو کا زمانہ دیکھا۔ لیکن اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی بڑے لوگ آنے والے کے لیے اپنا پیغام چھوڑ جاتے ہیں جس سے وہ بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب بچوں کو پسند آئے گی اور باپو کا پیار ان کے حوصلے کو بڑھائے گا اور وہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے۔

پی۔ ڈی۔ ٹنڈن

اپنے پیارے روہت کے نام

جس نے

اس کتاب کے مسودے کو پڑھا

اور

باپو سے متعلق اور بھی کچھ جاننا چاہا

فہرست

1۔	بچوں سے محبت	2
2۔	ڈاک ٹکٹ کی فرمائش	3
3۔	باپو کے لیے کھلونے اور مٹھائی	3
4۔	فیشن ایبل گاندھی	4
5۔	بھگوان کا سہارا	5
6۔	باپو اور نائی	6
7۔	انسانیت کا سچا نمونہ	9
8۔	گاندھی اور گورنر	10
9۔	آلو کے بیج کا مطالعہ	11
10۔	انصاف پسند گاندھی	12
11۔	درست مشورہ	13
12۔	بھگوان بچوں میں بستے ہیں	15
13۔	تھکے ہارے باپو	15

14۔	ماں باپ کا حکم مانو	16
15۔	بچوں کی فکر	16
16۔	بچوں کا سہارا	17
17۔	پاگل باپو	17
18۔	جنیو کیوں پہنا جاتا ہے؟	18
19۔	رام روئے کیوں تھے؟	19
20۔	زندگی بھگوان کی امانت	19
21۔	وعدہ نبھانے کا مشورہ	20
22۔	میں تجھے یاد کرتا ہوں	21
23۔	بچوں سے دلچسپی	21
24۔	لمبی عمر پاؤ	22
25۔	بچوں کی فکر	23
26۔	شاندار عظیم ہستی	24
27۔	بہادر انسان	25
28۔	ساری دنیا ان کا خاندان تھی	26
29۔	حساب کتاب کے پکے اور سچے	27
30۔	پیار ہی پیار	28
31۔	ماں باپ کا اثر	30
32۔	نقل کرنے سے انکار	31

33۔	بچے وطن کی جان ہیں	31
34۔	روح کی صفائی کے لیے بھوک ہڑتال	32
35۔	وہ صحیح بات کو مانتے تھے	33
36۔	بچوں کی مدد	35
37۔	چور گاندھی	36
38۔	بات کے پکّے	36
39۔	مرتے مرتے بچے	37
40۔	بچوں کے ساتھ کھیل کود	38
41۔	صفائی پسند باپو	39
42۔	سچائی کی قدر	40
43۔	بدھو باپو	40
44۔	پنسل کی تلاش	41
45۔	تیاگی بچہ	42
46۔	غضب کا انسان	43

بچو، آؤ تمھیں اس انسان کی کہانی سنائیں جو تم سے بہت پیار کرتا تھا اور جس نے انگلستان کے بادشاہ جارج پنجم سے کہا تھا:

''بچے تو میری جان ہیں''۔

وہ ایک انوکھا انسان تھا۔ قد کا چھوٹا ذات کا بنیا۔ جو تعلیم پانے کیلیے دیس سے باہر بھی گیا تھا اور جس کی شادی بہت چھوٹی عمر میں کر دی گئی تھی۔ طالب علمی کے زمانے میں اس نے کوئی ایسا بڑا یا نرالا کام نہ کیا جس سے اس کی شہرت ہوتی لیکن آگے چل کر اس نے ایسا کام کر کے دکھایا جس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ اس نے فوج اور ہتھیاروں کا سہارا لیے بغیر ہندوستان کو آزاد کرا لیا۔ وہ تھے مہاتما گاندھی۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آج تم کسی غلام ملک کے شہری نہیں ہو بلکہ ایک آزاد ملک کے رہنے والے ہو۔ لیکن وہ خود کو تم سے بھی زیادہ خوش نصیب سمجھتے ہیں جو کبھی انگریزوں کے غلام تھے اور جنھوں نے آزادی کے لیے قربانیاں دیں اور آخر ملک کو آزاد کرا لیا۔

بچو! اب میں تمھیں موہن داس کرم چند گاندھی کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بتاؤں گا جو بہت دل چسپ ہیں۔ ہاں۔ زیادہ تر تو میں تمھیں ایسی باتیں بتاؤں گا جو

تمھیں مزے دار بھی لگیں گی اور ان سے تمھاری ہمت بڑھے گی۔ تمھارے دل میں کچھ کر دکھانے کی لگن پیدا ہوگی۔ اچھا، سنو۔

بچوں سے محبت

گاندھی جی کو ان کے دیس کے رہنے والے احترام اور پیار سے باپو کہتے تھے وہ چاہے کیسے ہی کام میں کیوں نہ لگے ہوں بچوں کو کبھی بھولتے نہیں تھے وہ بچوں کے ہر خط کا جواب دیتے تھے۔ ایک لڑکا تھا جس کا نام مہادیو ہنگورانی تھا۔ اسے رات کو بہت ڈر لگتا تھا نہ جانے ایسا کیوں تھا؟ لیکن وہ بیچارا اچھی طرح سوبھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے باپ آنند ہنگورانی جی جان سے گاندھی جی کی قدر کرتے تھے اور انھیں کے ساتھ رہتے بھی تھے۔ ایک دن انھوں نے اس تکلیف کا باپو سے ذکر کیا۔ باپو نے فوراً مہادیو کو یہ خط لکھ دیا۔

بیٹے! تیری عمر بڑی ہو۔

آنند سے پتہ چلا کہ تو رات کو بہت ڈرتا ہے۔ ارے یہ رات کو ڈر کیسا؟ بھگوان رات کو سوتا نہیں۔ ہم لوگ تو سوتے ہیں اور بھگوان ہماری دیکھ بھال کرتا ہے۔ پھر ہم کیوں ڈریں؟ تو رام کا نام لے کر سویا کر اور ڈر کو دل سے نکال دے۔

باپو کی دعائیں

مہادیو کے ماں باپ یہ خط پاکر بہت خوش ہوئے اور انھوں نے یہ خط مہادیو کر پڑھ کر سنایا اور کہا کہ باپو نے لکھا ہے کہ تم بالکل نہ ڈرا کرو۔ اس کے بعد بچے کی وہ

تکلیف دھیرے دھیرے بالکل ختم ہوگئی۔ باپو نے مہادیو کو اور بھی کئی خط لکھے تھے جنھیں میں آگے چل کر تم لوگوں کو سناؤں گا، بلکہ ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خط تم خود اس کتاب میں دیکھ لوگے۔ ان کی لکھائی بہت خراب تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ بڑے آدمیوں کی تحریر خراب ہی ہوتی ہے۔ لیکن کسی امتحان میں کامیاب ہونے کے لیے تو یہ بات بہت ضروری ہے کہ تحریر اچھی ہو۔ تو بچو تم اپنی تحریر کا خیال رکھنا اور کوشش کرنا کہ تمہاری لکھائی بہت اچھی ہو۔

ڈاک ٹکٹ کی فرمائش

1945 میں کنیڈا سے ایک گیارہ برس کے بچّے نے باپو کو ایک خط میں لکھا:۔

''اگر آپ مجھے ہندستانی ڈاک ٹکٹ بھیج دیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی۔ اس کے بدلے میں میں آپ کو کنیڈا اور امریکہ کے ڈاک ٹکٹ بھیجوں گا۔''

اس بچے کو کیا معلوم تھا کہ گاندھی جی کو نہ ٹکٹوں کی ضرورت اور نہ ان کے جمع کرنے کا شوق۔ ان کے پاس تو ہر جگہ سے خط آتے تھے۔ لیکن باپو نے اس بچے کو مایوس نہیں کیا، اسے ڈاک ٹکٹ بھیج دیے۔

باپو کے لیے کھلونے اور مٹھائی

باپو کو بچوں سے بہت پیار تھا۔ جب بچے ان ملتے تھے تو وہ انھیں بہت پیار کرتے تھے۔ ایک بار جب وہ لندن میں تھے تو وہاں کے بچے ان سے ملنے آئے۔ وہ باپو کو ''چچا گاندھی'' کہتے تھے۔ یہ لوگ باپو سے بہت خوش رہتے تھے۔ ایک دن انھوں نے

ٹوکری بھر کھلونے اور مٹھائی باپو کو بھیجی۔ باپو بہت خوش ہوئے۔ لیکن ان کا شکریہ ادا نہ کر سکے کیوں کہ ان کو جلدی ہندوستان لوٹنا تھا۔ اور جب وہ ہندوستان پہنچے تو گرفتار کر لیے گئے۔ مگر وہ بچے ان کو جیل میں بھی یاد آتے رہے۔ وقت ملتے ہی باپو نے ان بچوں کو یہ خط لکھا:

میرے ننھے دوستو!

تمہاری یاد مجھے اکثر آتی ہے۔ اس دوپہر کو جب ہم لوگ اکٹھے بیٹھے تھے تو میرے سوالوں کے جواب تم نے بڑی سمجھداری سے دیے تھے اور جب میں کنگسلے ہال میں تھا تو میں تمہارے محبت بھرے تحفے کے لیے شکریہ ادا نہ کر سکا۔ اب یہ خط تم لوگوں کو جیل خانے سے لکھ رہا ہوں مجھے امید تھی کہ ہندوستان پہنچ کر تمہاری دی ہوئی چیزیں اپنے آشرم کے بچوں میں بانٹ دوں گا۔ لیکن میں آشرم تک پہنچ ہی نہ پایا۔ کیا ہنسی کی بات نہیں کہ جیل خانے میں رہ کر بھی میں اپنے آپ کو قیدی نہیں سمجھتا۔ میں یہی سمجھتا ہوں کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔

محبت کے ساتھ

وہی

جسے تم چچا گاندھی کہتے ہو

فیشن ایبل گاندھی

بچو، کیا تم جانتے ہو کہ جس زمانے میں گاندھی جی لندن اور دکنی افریقہ میں تھے تو بڑے فیشن ایبل تھے، وہ ٹوپ پہنتے تھے اور ٹائی لگاتے تھے۔ جب وہ ہندوستان

واپس آئے تو انھوں نے دیکھا کہ یہاں کی جنتا غریب اور دُکھی ہے، انھوں نے سوچا کہ انھیں اپنے لباس پر زیادہ خرچ کرنے کا حق نہیں، اس کے بعد انھوں نے دھوتی اور چپل پہننا شروع کر دیا ان کا کھانا بھی بہت سادہ ہوتا تھا۔ وہ بکری کا دودھ پینے اور کچھ پھل کھانے لگے تھے۔ اب انھوں نے اپنی زندگی کے لیے سخت قاعدے بنا لیے تھے۔ وہ صبح سویرے اٹھ کر بھجن کرتے اس کے بعد ایک چھوٹی سی سبھا ہوتی۔ اس میں آشرم والے شریک ہوتے اور بھجن گاتے۔ وہ صبح و شام گھومنے جایا کرتے تھے۔ اور کبھی کبھی مون برت یعنی چپ سادھنے کا برت بھی رکھتے تھے۔ اگر مون برت کے دن کوئی ضروری بات کہنی ہوتی تو کاغذ پر لکھ دیتے تھے۔ کھانے کا وقت مقرر تھا۔ اسی طرح سونے کا وقت بھی طے تھا۔ وقت کے مطابق ہی لوگوں سے ملتے تھے۔ مطلب یہ کہ سارا کام مقرر کیے ہوئے وقت کے مطابق ہی کرتے تھے۔

بھگوان کا سہارا

وہ ہر کام میں بھگوان اور جنتا کا سہارا لیتے تھے وہ بھگوان پر پکا یقین رکھتے تھے۔ وہ امیر اور غریب میں فرق نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ کوڑھیوں کے زخم وہ خود دھوتے اور صاف کرتے تھے۔ انھوں نے غریبوں کی مدد اور ہری جنوں کی خدمت میں اپنی زندگی صرف کر دی۔ ان کی پیدائش کاٹھیاواڑ (گجرات) کے ایک بنیا خاندان میں ہوئی اور چھوٹی سی عمر میں کستوربا سے ان کی شادی ہوگئی۔ اس وقت ان دونوں کی عمر برابر ہی تھی۔ اور وہ دونوں اپنے بچوں اور دوسروں کے بچوں میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے۔ وہ چھوٹے آدمی کی بات بھی اتنی ہی توجہ سے سنتے تھے جتنی توجہ سے بڑے آدمی

کی۔ کسی کو نقصان پہنچانا ان کی عادت نہیں تھی۔ مختصر یہ کہ انھیں دنیا کے سارے انسانوں سے محبت تھی۔

باپو اور نانی

بچو، اب ایک اور بات سنو، جو شاید تمھیں بہت اچھی لگے۔ گاندھی جی، موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو کے گھر کو اپنا ہی گھر سمجھتے تھے۔ جب کبھی الہ آباد جاتے تو ان کے گھر آنند بھون ہی میں ٹھہرتے۔ نہرو خاندان کے لوگ بھی ان کو اپنا بزرگ سمجھتے

تھے اور ضروری باتوں میں ان کی رائے لیتے تھے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہ آنند بھون میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ ایک نائی ان کی حجامت کے لیے بلوایا گیا وہ نائی انگریزی لباس پہنتا تھا۔ اور سب لوگ جانتے تھے کہ باپو کھادی پہنتے ہیں، کھادی ہی کا پرچار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہر آدمی کھادی لباس پہنے۔ نائی ان کے سامنے آنے سے ہچکچایا جواہر لال نہرو کے ذاتی سکریٹری جناب شیودت اپادھیائے کی بھی ہمت نہ ہوئی کہ وہ نائی کو باپو کے سامنے انگریزی لباس میں بھیج دیں۔ انھوں نے کہیں سے کھادی کے کپڑے منگوائے اور نائی نے ان کو پہن لیا۔ آپ جانتے ہیں کہ دوسرے کا لباس فٹ نہیں آتا۔ وہ یا تو ڈھیلا ہوتا ہے یا تنگ اور چھوٹا۔ خیر جب نائی بھیس بدل کر باپو کے پاس پہنچا تو باپو بولے۔ کیوں بھئی یہ کیا مانگے کے کپڑے پہنے ہو۔ یہ سن کر نائی سٹپٹا گیا، کچھ شرمایا بھی۔ پھر بھی اس نے باپو کی حجامت بنانی شروع کر دی۔ نائی عام طور سے بڑے باتونی اور چالاک ہوتے ہیں۔ جب حجامت بن چکی تو اس نے باپو سے کہا۔ میں نے بڑی محنت سے آپ کی حجامت بنائی ہے۔ اب آپ ایک سارٹیفکٹ عنایت فرمایئے۔ اس پر باپو نے اسے سمجھایا کہ جو لوگ اچھا کام کرتے ہیں ان کو کسی سارٹیفکٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیکن نائی نہیں مانا اور اپنی ضد پر اڑا رہا۔ کیوں کہ اسے یقین تھا کہ باپو کے سارٹیفکٹ سے اسے بڑا فائدہ پہنچے گا۔ اور باپو بھی بڑے مہربان انسان تھے۔ انھوں نے ایک سارٹیفکٹ اسے دے دیا۔

بہت دنوں بعد میں اس نائی کی دُکان پر حجامت بنوانے گیا تو باپو کا دیا ہوا وہ سارٹیفکٹ ایک فریم میں جڑا ہوا دیوار پر لٹکا پایا۔ میں اخبار نویس ہوں، اس لیے مجھے اس کی اہمیت معلوم تھی۔ اور مجھے لکھنے کا کافی مواد مل گیا۔ اب مجھے بال کٹوانے میں

دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ میں نے اس نائی سے باپو کے دیے ہوئے سارٹیفکٹ کے بارے میں بات شروع کردی۔ میری دل چسپی دیکھ کراور میرا پیشہ جان کر نائی اپنا وہ واقعہ بڑی لگن سے سنانے لگا۔

اس نے بتایا کہ جب وہ باپو کی حجامت بنارہا تھا تو لوگ ان سے ملنے آئے اور وہ حجامت بنوانے میں ہی ان سے باتیں کرتے رہے۔ جب حجامت بن چکی تو مجھے دو روپیے ملے اور میں آنند بھون سے خوشی خوشی گھر واپس آیا ایک بات اور ہے اور وہ یہ کہ جب وہ باتونی نائی حجامت بنارہا تھا تو کسی نے ان کا فوٹو کھینچ لیا تھا اور نائی نے وہ تصویر بھی اس سے مانگ لی تھی اور اسے ہاتھ کے سارٹیفکٹ کے ساتھ فریم کرا کے اپنی دکان پر لٹکایا تھا۔ اپنے مطلب کی ساری معلومات میں حاصل کرہی چکا تھا۔ اب میں اس فکر میں تھا کہ کسی طرح اس سارٹیفکٹ کی تصویر لے لی جائے کیوں کہ میں اسے اخبار میں چھپوانا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا: بھائی تھوڑی دیر کے لیے اس فریم کو لے جانے دو۔ اس کا فوٹو کھنچوا کر اسے جلد لوٹا دوں گا اور اگر چاہو تو مجھ سے اس کی قیمت لے لو۔ اس پر نائی مسکرایا اور بولا، میں اس سارٹیفکٹ کو نہ تو دے سکتا ہوں اور نہ بیچ سکتا ہوں۔ یہ تو میری سب سے بڑی جائداد ہے۔ میں یہ اپنی اولاد کو دوں گا۔

وہ میرے بال کاٹتا رہا اور میں سوچتا رہا کہ اس سارٹیفکٹ کی تصویر کس طرح لی جائے کہ اخبار میں چھپ سکے۔ اچانک مجھے پڑوس کے ایک ڈاکٹر کے۔سی۔ مترا کا خیال آیا جو اس علاقے کے لوگوں کا مفت علاج کرتے تھے اس لیے مریض ان کی بڑی عزت کرتے تھے۔ وہ میرے اچھے دوست تھے۔ میں نے ان سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ میں نے کہا وہ نائی آپ کا جاننے والا ہے۔ مجھے اس سے ایک گھنٹے کے لیے وہ

فریم دلوادیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی چھڑی لے کر میرے ساتھ اس کی دکان پر پہنچے۔ اور اس سے کہا کہ وہ فریم مجھے دے دے۔ نائی ڈاکٹر صاحب سے انکار نہ کر سکا۔ ذرا سی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے وہ تصویر والا فریم میرے حوالے کر دیا۔ جب میں چلنے لگا تو وہ بولا: میں یہیں بیٹھا انتظار کر رہا ہوں، فریم سے کام لے کر دو گھنٹے میں مجھے لوٹا دیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس کا فوٹو کھنچوا کر میں جلد ہی واپس کر دوں گا۔ میں نے فوٹو گرافر سے اس کی نقل کرالی اور فریم نائی کو لوٹا دیا۔ کچھ دنوں بعد میں نے ایک مضمون لکھا اور اس میں یہ سارا قصہ بیان کر دیا۔ پڑھنے والے نائی کی ہوشیاری اور باپو کی رحم دلی اور خوش اخلاقی سے متاثر ہوئے۔

انسانیت کا سچا نمونہ

باپو کے دشمن اور مخالف بھی ان کا لوہا مانتے تھے انھوں نے کبھی اپنے دشمن کو بھی نقصان پہنچانا نہیں چاہا بلکہ وہ ان سے بھی پیار کرتے تھے۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ باپو میں سب سے بڑی خوبی کیا تھی تو میں یہ کہوں گا کہ انسانیت کا جذبہ ان میں بہت تھا اور یہی ان کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی تھی۔ خوف تو ان کو چھو بھی نہیں گیا تھا۔ وہ محبت، مہربانی اور بزرگی کے اتھاہ سمندر تھے۔ وہ انسان میں بھگوان کا روپ دیکھتے تھے، انسان گاندھی سیاست داں گاندھی سے کیوں عظیم تھے۔ وہ عظیم اس لیے نہیں تھے کہ وہ ایک کامیاب لیڈر تھے بلکہ اس لیے کہ وہ انسان دوستی کا سچا نمونہ تھے۔

گاندھی جی اور گورنر

1945 میں جب ہندوستان غلام تھا تو باپو بنگال کے گورنر مسٹر کیسی سے ملنے گئے، جب وہ واپس ہونے لگے تو گورنر صاحب اچانک باپو کے ساتھ چل پڑے اور ان کو راج بھون کی نچلی منزل تک پہنچایا۔

اس زمانے میں گورنر کا رتبہ بہت بڑا ہوتا تھا۔ اور اس زمانے میں تو یہ بڑی ہی حیرت کی بات تھی کہ گورنر ایک سیاست داں اور حکومت کے باغی کو راج بھون سے نیچے کار تک پہنچانے آئے اور ان کا اتنا احترام کرے۔ اس کا سبب یہی تھا کہ باپو جس سے بھی ملتے تھے اس کو بہت متاثر کرتے تھے اور ملنے والا دل سے ان کی عزت کرنے لگتا تھا۔

اس دن کیسی صاحب نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ ان کی کوٹھی کے سب ہی ملازم جن کی تعداد قریب دو سو کے تھی، ہال میں ہاتھ جوڑے ہوئے گاندھی جی کے درشن کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ وہ اچھا لباس بھی پہنے ہوئے نہیں تھے اس طرح کے لباس میں وہ لاٹ صاحب کے سامنے کبھی نہیں آتے تھے۔ وہ اتنی جرأت ہی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ گورنر صاحب گاندھی جی کے ساتھ اس طرح نیچے تک پہنچ جائیں گے ان بیچاروں کو جب پتہ چلا کہ گاندھی جی کوٹھی میں آئے ہیں تو انھوں نے سوچا کہ باپو کو دیکھنے کا یہ اچھا موقع ہے۔ جب انھوں نے باپو کے ساتھ گورنر کو دیکھا تو بہت سٹپٹائے اور کیسی صاحب بھی انھیں دیکھ کر حیران ہوئے۔ انھوں نے راج بھون کے ملازموں کی طرف اشارہ کر کے کہا: مسٹر گاندھی دیکھیے اور

یقین کیجیے کہ میں نے ان لوگوں سے یہاں جمع ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔ ان ملازموں میں مسلمان بھی تھے۔ کیسی صاحب کو اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ مسلمان بھی گاندھی جی کی دل سے اتنی عزت کرتے ہیں۔

آلو کے بیج کا مطالبہ

جس سال باپو گورنر کیسی صاحب سے ملنے گئے اسی سال کا ایک اور قصہ سنیے۔ گاندھی جی کے دوست ستیش بابو نے انھیں بتایا کہ آلو بونے کا موسم ایک ہفتہ بعد ختم ہو جائے گا لیکن بے چارے کسانوں کے پاس آلو کے بیج کی بہت کمی ہے۔ ان دنوں وہاں آلو پر کنٹرول تھا اور بازار میں آلو نہیں ملتا تھا۔ بڑے بیوپاریوں نے پیسہ کمانے کے لیے آلو کے بیج کو گوداموں میں چھپا رکھا تھا جب باپو کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے سوچا کہ اس چھوٹی سے بات کو گورنر صاحب سے کیوں نہ کہا جائے۔ وہ غریبوں کا بہت خیال کرتے تھے۔ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اتنی چھوٹی سی بات گورنر صاحب سے کہی جائے یا نہ کہی جائے۔ انھوں نے فوراً گورنر کیسی صاحب کو ایک خط میں لکھا کہ آلو بونے والوں کی مدد کی جائے تو اچھا ہوگا۔

جب گورنر کیسی کو باپو کا وہ خط ملا تو انھیں بہت تعجب ہوا۔ انھوں نے ملاقاتی سدھیر گھوش سے کہا کہ وہ آسٹریلیا اور برطانیہ کی سیاست کو خوب جانتے ہیں لیکن ابھی تک ان سے کسی نے آلو کے بیج لوگوں کو دلوانے کے لیے نہیں کہا تھا پھر بھی یہ بات ٹالی نہیں جا سکتی تھی۔ انھوں نے فوراً کہا کہ آلو کے بیج کا آج ہی انتظام کیا جائے کیوں کہ اس کی وجہ سے مسٹر گاندھی بہت پریشان ہیں۔ حکم پاتے ہی سکریٹری نے دوسرے افسر

کو بلوایا اور آلو کے بیج تقسیم کرنے کا بندوبست کیا۔ جب یہ بات باپو کو معلوم ہوئی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

انصاف پسند گاندھی

پیارے بچو، مجھے باپو کو جاننے اور سمجھنے کا جو موقع ملا ہے، اسے میں نے ہمیشہ اپنی خوش نصیبی سمجھا ہے۔ 1945 میں میں نے جواہر لال نہرو پر ایک کتاب لکھی تھی اور باپو سے اس کتاب کا دیباچہ لکھنے کی درخواست کی تھی۔ وہ مان گئے، میں بیحد خوش ہوا اور کتاب کی ایک نقل ان کی خدمت میں بھجی۔ میں دیباچہ کا انتظار کرتا رہا۔ کئی مہینے گزر گئے نہ دیباچہ آیا اور نہ ہی باپو نے میرے خط کا جواب دیا۔ میں بہت پریشان ہوا اور غمگین بھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔ ہر وقت یہی بات ستاتی رہتی تھی۔ ان دنوں آچاریہ کرپلانی کی مہربانی سے میں سوراج بھون الہ آباد میں رہتا تھا۔ جو لیڈر صاحبان مجھ پر مہربان تھے وہ سب جیل میں تھے، میں بہت پریشان تھا سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کی مدد سے باپو سے دیباچہ منگوایا جائے۔ کچھ دن بعد پتا چلا کہ ایک خاتون نے میرے خلاف باپو سے کچھ کہہ دیا ہے اس لیے وہ بڑی الجھن میں ہیں، وہ خاتون مجھ سے ناراض رہتی تھیں اور میں جب بھی ان کو دیکھتا تو غصے کے مارے مجھے بخار ہو جاتا تھا۔ ان سے بات کرنے میں مجھے الجھن ہوتی تھی، لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ اس نے میرے کام میں رکاوٹ تو ڈال ہی دی تھی اور مجھے اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ انھوں نے کیا شکایت کی تھی یہ بھی معلوم نہ تھا۔ لیکن میں اپنے معاملے کو صاف کس طرح کروں؟ یہ پریشانی مجھے ستاتی رہی۔

مہینوں انتظار کے بعد کہیں قسمت جاگی۔ آچاریہ کرپلانی جیل خانے سے رہائی پاکر سوراج بھون لوٹے تو ان کو میں نے ساری داستان سنائی۔ جب وہ باپو سے ملے تو ان سے پوچھا۔ آپ نے وعدہ کر کے بھی ٹنڈن کی کتاب کا دیباچہ کیوں نہیں لکھا؟ اس سے پہلے بھی وہ ایک خط باپو کو لکھ چکے تھے۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ کسی نے گاندھی جی سے میرے خلاف شکایت کر دی ہے تو وہ بہت جھنجھلائے اور گاندھی جی سے بولے۔ ''اس شخص کے بارے میں تو میں خود آپ سے کہہ چکا تھا۔ اگر اس کے خلاف کوئی شکایت پہنچی تھی تو آپ کو اس سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔ کسی اور کی بات نہیں ماننی چاہیے تھی۔'' یہ بات باپو کی سمجھ میں آ گئی انھوں نے محسوس کیا کہ واقعی غلطی ہوگئی ہے۔ بس پر کیا تھا انھوں نے فوراً ایک زوردار دیباچہ لکھا اور مجھے بھیج دیا۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک خط بھی لکھا اسے پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ انھوں نے خط میں لکھا تھا:

> ''بھائی ٹنڈن، مجھے افسوس ہے کہ تمھاری کتاب کے لیے اس سے پہلے کچھ لکھ کر نہیں بھیج سکا۔ اس کی ایک وجہ تو کام کی زیادتی تھی اور دوسری وجہ لکھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن بھائی جواہر لال کے بارے میں نہ لکھوں، یہ بھی کیسے ہوسکتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ دیر کی وجہ سے میرا دیباچہ بے وقت کی چیز نہیں سمجھا جائے گا۔''

باپو ایک عظیم شخصیت کے مالک تھے وہ کبھی اپنی غلطی ماننے سے سے ہچکچاتے نہیں تھے ہم سب کو ان سے یہ بات سیکھنی چاہیے۔

درست مشورہ

میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ نہرو خاندان کے لوگ گاندھی جی کو اپنا بزرگ سمجھتے تھے اور ان سے ہر معاملے میں صلاح اور مشورہ کرتے تھے۔ محترمہ

وجے لکشمی پنڈت کے شوہر رنجیت پنڈت کے انتقال کے بعد شریمتی پنڈت نے سوچا کہ ان کے دیوران کے ساتھ بڑی ناانصافی کر رہے ہیں وہ ایک پرانے قانون کا سہارا لے کر انھیں اور ان کی بیٹیوں کو رنجیت پنڈت کی جائداد سے محروم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس لیے جب وہ امریکا جانے والی تھیں تو باپو سے ملنے گئیں۔
باپو نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔

کہو، گھر والوں سے جھگڑا طے ہوا؟

یہ سن کر وجے لکشمی پنڈت کے دل کو چوٹ سی لگی اور انھوں نے جواب دیا۔ میرا کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ لیکن اب میں ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی جو ایک پرانے قانون کا سہارا لے کر نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔

باپو جی بولے ''تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے وجے لکشمی پنڈت کو مشورہ دیا کہ امریکا جانے سے پہلے انھیں اپنے دیور وغیرہ سے مل لینا چاہیے۔ مسز پنڈت کو یہ مشورہ پسند نہ آیا۔ بولیں: باپو یہ تو میں آپ کو خوش کرنے کے لیے بھی نہیں کروں گی۔ لیکن گھر جا کر سوچا تو بات سمجھ میں آ گئی۔ وہ اپنے دیور سے ملنے گئیں وہاں جا کر لوگوں سے بات چیت کی تو محسوس کیا کہ دل بہت ہلکا ہو گیا ہے اور سارا غصہ ختم ہو چکا ہے۔ مسز وجے لکشمی پنڈت سے باپو نے کہا تھا ''تمھیں اپنے سوا کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔ مسز پنڈت کہا کرتی تھیں: ''یہ میری زندگی کی سب سے سچی اور اچھی صلاح تھی جو باپو نے مجھے دی تھی، اور اس نے زندگی میں اکثر میرا ساتھ دیا۔''

بھگوان بچوں میں بستے ہیں

بہت سے لوگوں کو بچوں سے پیار ہوتا ہے لیکن باپو جس طرح بچوں کو چاہتے اور پیار کرتے تھے وہ سب سے انوکھا تھا۔ وہ ہر بچے میں ہندوستان کے مستقبل کی تصویر دیکھنے کی کوشش کرتے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ ان میں کچھ ایسے بچے ہوں گے، جن سے ہندوستان کی قسمت جگمگائے گی۔ وہ ملک کی رہ نمائی کریں گے اور اس کی باگ ڈور سنبھالیں گے۔ ہندوستان کی تقدیر انھیں کے ہاتھ میں ہوگی۔ باپو کی تمنا تھی کہ سب بچوں کو اچھی تعلیم ملے ان کی اچھی پرورش ہو، ان کے ماں باپ ان کو اچھا اور نیک راستہ دکھائیں۔ وہ بچوں کی مشکلات کے بارے میں کبھی ناامید نہیں ہوتے تھے بڑے بڑے مسئلے ان کے سامنے آتے تھے۔ مصروف ہوتے ہوئے بھی وہ بچوں کے لیے وقت نکال ہی لیتے تھے۔ وہ بچوں کو خدا کی پھلواری کے پھول سمجھتے تھے۔ عیسیٰ مسیح کی طرح ان کا یقین تھا کہ بھگوان بچوں میں بستا ہے۔

تھکے ہارے باپو

یہ کئی برس کی بات ہے کہ اندرا گاندھی اپنے بیٹے راجیو کے ساتھ باپو سے ملنے گئیں۔ گاندھی جی ان دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور کہا:

''میرا دماغ بہت سی پیچیدہ باتوں میں الجھا ہوا تھا، کئی بڑے آدمی مجھ سے بحث کر چکے ہیں، میں بہت تھکا ہارا ہوں، اب تم میرے دماغ پر قبضہ جما لوگے تو وہ تھکاوٹ دور ہو جائے گی۔''

ماں باپ کا حکم مانو

کیلاش ناتھ ترپاٹھی نام کے ایک طالب علم نے ایک بار باپو کو خط لکھ کر پوچھا

''اگر ستیہ گرہ زوروں سے چھڑ جائے تو مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

باپو نے جواب میں لکھا:

کیلاش ناتھ، جیتے رہو۔

تمہارا خط ملا، افسوس قید خانے میں ہوں اس لیے تمھیں کوئی مشورہ نہیں دے سکتا ہاں تمھارے ماں باپ جو کچھ کہیں وہی کرو۔ خاص طور سے وہ کرو جس سے تمھاری ماں کو خوشی حاصل ہو۔

بچوں کی فکر

یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مہادیو ہنگورانی کے ماں باپ کو جانتے تھے مہادیو بہت کم عمر تھا اس پر بھی وہ باپو کو خط لکھتا تھا اور گاندھی جی اس کے خط کا جواب دیا کرتے تھے۔ ایک بار مہادیو سخت بیمار پڑا، جب صحت ذرا ٹھیک ہوئی تو اس نے باپو کو فوراً خط لکھا اور انھوں نے بھی خط پاتے ہی فوراً پڑھا اور جواب لکھا:

''تمھیں اس کمزوری کی حالت میں خط نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ اب جب بالکل

اچھے ہو جاؤ تو لکھنا۔"

بچوں کا سہارا

ہندوستان کی تقسیم کے بعد باپو کچھ دن نواکھالی میں رہے وہاں کے حالات سے انھیں بہت دکھ ہوا۔ بڑے بڑے لوگ تو ڈر کے مارے گھروں سے نکلتے نہیں تھے لیکن بچے باپو کے پیچھے پیچھے چلتے ان کے ساتھ کھیلتے اور رگھوپتی راگھو راجا رام گاتے تھے اس سے باپو بہت خوش ہوتے تھے۔ اس بارے میں انھوں نے لکھا" میں نے گھور اندھیرے میں روشنی دیکھی، دل میں امید سے بھر گیا اور یہ بچوں کے یقین کا کمال ہے۔"

باپو بچوں کو اپنی زندگی کا سہارا سمجھتے تھے۔

پاگل باپو

باپو جب بچوں کے ساتھ ہوتے تھے تو ان کا دل خوش رہتا تھا۔ بچوں کی زندگی میں وہ خوشیوں کا دریا بہا دینا چاہتے تھے۔ وہ ان سے خوب کھیلتے انھیں خوب ہنساتے تھے۔ ایک بار کسی بات پر ایک بچے نے باپو کو پاگل کہہ دیا تو باپو قہقہہ مار کر ہنسنے لگے، اس کے ماں باپ فوراً اسے گاندھی جی کے پاس لے گئے۔ وہ بہت شرمندہ تھے، باپو نے اس بچے سے پوچھا:

تم نے مجھے پاگل کیوں کہا؟

بچے نے جواب دیا۔

ایک بار جب میں اکیلے اکیلے کچھ کھا رہا تھا تو میری ماں نے مجھے پاگل کہا تھا اور میں نے آپ کو اس لیے پاگل کہا کہ آپ بھی اکیلے ہی کچھ کھا رہے تھے۔

یہ سن کر باپو نے زوردار قہقہہ مارا، پھر کہا کہ تم نے ٹھیک ہی کہا۔

انھوں نے اسے ایک پھل کھانے کو دیا تو اس نے لینے سے انکار کر دیا۔

باپو بولے۔

''ارے تم نے پاگل بننے سے انکار کیوں کیا؟'' اس نے جواب دیا کہ میری ماں نے کسی دوسرے کی چیز کھانے سے منع کر رکھا ہے۔ باپو بولے۔ ''ہاں، ایک دم نہیں لے لینے چاہیے لیکن جب کوئی بار بار کہے تو ضرور لینی چاہیے۔''

جب اس کی ماں نے کہا لے لو تو اس بچے نے خوشی خوشی لے لیا، باپو جانتے تھے کہ بچے بہت بھولے اور سادہ ہوتے ہیں اور ماں باپ ان کی زندگی پر بہت اچھا اثر ڈال سکتے ہیں اسی لیے وہ بچوں میں بڑی دل چسپی لیتے تھے۔

جنیو کیوں پہنا جاتا ہے

ایک دفعہ ایک ننھی سی بچی نے باپو سے سوال کیا۔

''لوگ جنیو کیوں پہنتے ہیں؟ اور گائے کو ماتا کیوں کہتے ہیں۔''

باپو نے جواب دیا۔

''اس لیے کہ یہ کسی حد تک انسان کو پاک بنانے میں مدد دیتا ہے۔ آج کل لوگ اس بات کو نہیں سمجھتے۔ اسی طرح گائے کو ماں اس

لیے کہا جاتا ہے کہ وہ ماں کی طرح دودھ دیتی ہے۔ اسی لیے اس کو سب کی ماتا یا گئو ماتا کہا جاتا ہے۔ ماں تو اپنے بچوں سے خدمت بھی لیتی ہے لیکن گائے کی خدمت کوئی نہیں کرتا اسی لیے گائے کو لوگ گئو ماتا کہتے ہیں۔''

باپو بچوں کے سوالوں کے جواب اچھے ڈھنگ سے دیتے تھے۔ اور اس طرح سمجھاتے تھے کہ بات دل میں بیٹھ جائے اور دماغ پر اس کا اثر ہو۔

رام روئے کیوں تھے

ایک بار ایک لڑکے نے باپو سے پوچھا کہ رام جیسے عظیم انسان کو سیتا کی جدائی میں پاگلوں کی طرح رونے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کو رونا نہیں چاہیے تھا۔ باپو نے اس کے سوال کا یہ جواب دیا۔

''کسے پتا ہے کہ رام کو سیتا کی جدائی کا دکھ تھا یا نہیں، ان کے بارے میں ہم جو کچھ پڑھتے ہیں وہ شاعر کا خیال ہے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ اتنے بڑے انسان کو رونا زیب نہیں دیتا، اس لیے ہمیں یہ یقین کر لینا چاہیے کہ سیتا سے بچھڑ جانے کا رام کو اتنا دکھ نہیں پہنچا ہوگا۔''

زندگی بھگوان کی امانت ہے

ایک بار باپو کو پتا چلا کہ ہیم پربھا کا بچہ ارون سخت بیمار ہے لیکن اس پر بھی آرام سے لیٹتا نہیں تو انھوں نے اس بچے کو یہ خط لکھا:

''تمہاری ماں یہ شکایت کرتی ہے کہ تم کمزور ہو، پڑھنے لکھنے کے لیے ضد کرتے ہو، کیا تم اپنے جسم کو آرام دینا نہیں چاہتے، اس طرح تم جلد تندرست ہو جاؤ گے ویسے جینا مرنا ایک سکے کے دو رُخ ہیں ہمیں تو اسی خوشی سے مرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جتنی خوشی سے ہم جیتے ہیں۔ لیکن جب تک زندگی ہے ہمیں اپنے جسم کو آرام بھی دینا چاہیے کیوں کہ زندگی ہمارے پاس بھگوان کی امانت ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اسے سنبھال کر رکھیں۔ اچھا اگر تم لکھنے کے لائق ہو جاؤ تو ضرور لکھنا۔''

وعدہ نبھانے کا مشورہ

جب کبھی باپو فرصت کا تھوڑا سا وقت بھی پاتے تو وہ آشرم کے بچوں کو خط لکھا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک بار اپنے خط میں لکھا تھا۔

''بچو اور بچیو، بچے عام طور سے بھولے بھالے رحم دل اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں، ان میں بڑپن اسی وقت آتا ہے جب وہ بڑے ہو جاتے ہیں، ان کی شرارت میں بھی بھولا پن ہوتا ہے۔ اگر تم اس بات کو سچا مانتے ہو تو تم سب کو ایک دوسرے کی خدمت کرنی چاہیے جس سے وہ اوپر اُٹھ سکیں تمھیں ایک دوسرے پر نگاہ بھی رکھنی چاہیے لیکن تمہاری یہ نگرانی پولیس والوں کی سی نہیں ہونی چاہیے بلکہ ایسی ہونی چاہیے جیسے بھگوان کی۔ لیکن سزا دینے کے لیے نہیں بلکہ سدھار کے لیے ہونے چاہیے۔ اس نگرانی کا مقصد یہ بھی ہونا چاہیے کہ تم ایک دوسرے کو وہ سکھاؤ جو وہ نہیں جانتے اگر کوئی جھوٹ بولتا

ہے تو اسے محبت سے جھوٹ کے جال سے بچانا چاہیے اور اگر تم نے کسی سے کوئی وعدہ کیا ہے تو اسے یاد رکھنا اور نبھانا چاہیے۔''

میں تجھے یاد کرتا ہوں

مہادیو ہنگورانی نے ایک دن اپنے باپ سے پوچھا۔

''کیا باپو بھی کبھی مجھے یاد کرتے ہیں؟''

اس کے باپ نے یہ بات فوراً باپو کو لکھ بھیجی اور کچھ ہی دن بعد باپو نے مہادیو کو خط لکھ بھیجا۔

''تو خود تو خط لکھتا نہیں اور مہادیو سے پوچھتا ہے ''کیا باپو کبھی مجھے یاد کرتے ہیں؟''

''میں تو یاد کرتا ہی ہوں اب برابر مجھے لکھتے رہنا کہ کیا پڑھتا ہے، کیا کھاتا ہے؟ اور کب سوتا ہے، یہ بھی لکھنا۔''

بچوں سے دل چسپی

باپو بچوں کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی گہری دل چسپی لیتے تھے ایک مرتبہ مہادیو نے باپو کو ایک خط لکھا اس کے خیال میں اس خط میں کچھ غلطیاں تھیں۔ باپو نے خط پڑھا تو وہ غلطیاں

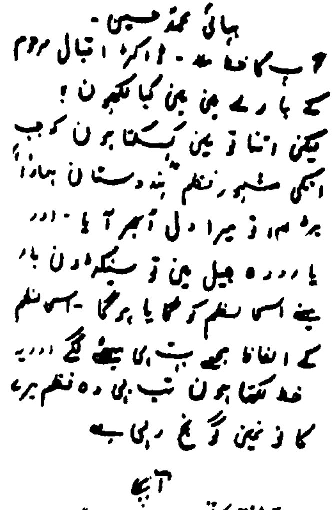
بھائی محمد حسین -
آپ کا خط ملا - ڈاکٹر اقبال مرحوم
کے بارے میں میں کیا لکھوں !
لیکن اتنا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ جب
ان کی مشہور نظم "ہندوستاں ہمارا"
پڑھی، تو میرا دل اُبھر آیا - اور
یارودا جیل میں تو سینکڑوں بار
میں نے اس نظم کو گایا ہوگا - اس نظم
کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ
خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے
کانوں میں گونج رہی ہے
آپ کا
(مہاتما گاندھی کی تحریر) مو ک گاندھی

(مہاتما گاندھی کی تحریر)

درست کردیں اور خط اسے لوٹا دیا۔
انھوں نے لکھا:
''تیرا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، کچھ غلطیاں ہیں لیکن فکر کی کوئی بات نہیں لفظ پری کشا نہیں پریکشا ہے صیحت نہیں صحت ہے۔''

رات کو جپ صاحب پڑھنا اچھا ہے۔ تیرا فوٹو میں نے دیکھا۔ میری دعائیں اس کو دیکھ کر بھی نکلیں۔ تیرے پاؤں میں گٹھلی نہیں ہے کسرت کیا کر۔ تو کچھ کمزور سا لگتا ہے۔''

لمبی عمر پاؤ

جب مہادیو کی عمر پندرہ برس کی تھی تو اس نے ایک خط باپو کے نام بھیجا اور ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ باپو نے جواب میں لکھا:

''تمہارا خط پا کر مجھے بہت خوشی ہوئی ایسا لگتا ہے کہ جیسے تم نے کل ہی جنم لیا ہو۔ اب تو یہ سوچنا کہ تم نے پندرہ برس کی عمر کو پار کر لیا ہے میرے لیے بے حد مشکل ہے۔ مجھ سے مل کر تم کیا پاؤ گے؟ اور پھر ہمارے دل تو ایک دوسرے سے ملے ہی رہتے ہیں بس یہی دعا ہے کہ لمبی عمر پاؤ اور بڑی مدت تک اپنے ملک کی خدمت کرو۔''

بچوں کی فکر

باپو سدا بچوں پر مہربان رہتے تھے اور ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ وہ انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں پر مشورے دیتے تھے انھوں نے خاص طور سے مہادیو کی ماں کو بار بار بہت کچھ لکھا۔

مثال کے طور پر

''میری رائے میں ہاضمے کے لیے مہادیو کو دس بوندیں کیسٹر ایل دینا بہت اچھا ہے اگر تم نے آلِو آئل یعنی زیتون کے تیل کا استعمال پہلے ہی سے شروع کر رکھا ہے تو وہی اسے دیتی رہو۔''

''مہادیو کی صحت اب کیسی ہے، وہ کتنا دودھ پیتا ہے اس سے اسے کوئی مشکل تو پیش نہیں آتی ؟ کیا تم اسے ٹہلانے کے لیے کہیں لے جاتی ہو؟''

''اگر تم خود مہادیو کی ضرورتوں کی طرف توجہ دو تو بہت اچھا ہوگا۔ جہاں تک تم خود اس کام کو انجام دے سکو دیے جاؤ۔ کیا مہادیو کو نارنگی یا موسمی کا رس دیتی ہو؟ اور سنو بچوں کو نارنگی اور انگور کا رس بھی دینا چاہیے۔''

''جب تک مہادیو پڑھ رہا ہے اس وقت تک ودّیا کو اس کے ساتھ نرمی اور سختی دونوں کا برتاؤ کرنا ہوگا، بچوں کا پالنا پوسنا ایک ہنر ہے۔ ودّیا کو چاہیے کہ وہ یہ ہنر حاصل کرے۔''

شاندار عظیم ہستی

بچو تمھیں یہ جان کر حیرت ہوگی کہ باپو کے پاس کوئی فوج تھی نہ ہتھیار۔ پھر بھی انھوں نے انگریز سرکار کو کیسے شکست دے دی۔ اور کیا وجہ ہے کہ اس ملک کے سب ہی رہنے والے ان کی اتنی عزت کرتے تھے۔. اس کی وجہ یہ ہے کہ باپو کا کردار بہت بلند تھا۔ وہ دشمن سے بھی نفرت نہیں کرتے تھے۔ اور نہ اس کے ساتھ مکاری سے پیش آتے تھے۔ یہاں تک کہ جو ان کو ستاتا تھا وہ اسے بھی ستانا پسند نہیں کرتے تھے۔ جو کوئی ان سے نفرت کرتا تھا وہ اس کے ساتھ محبت اور مہربانی کرتے تھے۔ جو لوگ انھیں جیل بھیجتے تھے ان سے بھی باپو کوئی بیر نہیں رکھتے تھے۔ وہ دکھ درد جھیل کر دوسروں کا سدھار کرتے تھے۔ ان کے آشرم میں اگر کسی سے غلطی ہو جاتی تو معافی باپو مانگتے تھے۔ کوئی ان کی درست بات کو بھی سننے سے انکار کر دیتا تو وہ اس سے کوئی لڑائی جھگڑا نہ کرتے نہ اس پر خفا ہوتے۔ بلکہ برت رکھتے اور اس طرح اس کے جرم کی سزا بھگتتے اور عبادت کے بدلے بھگوان سے امید رکھتے تھے کہ وہ اچھا پھل دے گا۔ انھوں نے انگریز سرکار سے صحیح کام کرانے کے لیے کئی مرن برت رکھے۔ جب وہ برت رکھتے تو لوگ ان کی طرف سے فکر مند ہو جاتے کیوں کہ سب جانتے تھے کہ باپو سچ کے لیے جان تک قربان کر دیں گے۔ اس عظیم شخصیت کی موت کی ذمہ داری نہ تو جنتا لے سکتی تھی نہ انگریز سرکار۔ چنانچہ ان کے برت کا اثر ہوتا تھا اس کی وجہ سے کئی بار انگریز سرکار نے ان کی کئی مانگیں مان لی تھیں۔ باپو لوگوں سے ایک انوکھا برتاؤ کرتے تھے اسی لیے وہ اس دنیا میں انوکھے انسان تھے۔ جب ہندو مسلمان آپس میں لڑتے اور ایک

دوسرے کو مارتے کاٹتے تھے تو باپو فوراً مرن برت رکھتے تھے یعنی اپنی بات منوانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جانے کو تیار ہو جاتے تھے۔ پھر ان ہندوؤں اور مسلمانوں کو ہوش آتا تھا اور دنگے فساد سے توبہ کر لیتے تھے اور باپو سے برت ختم کرنے کی درخواست کرتے تھے۔ ہندوستان میں باپو کی بڑی شاندار حیثیت تھی۔ شاید صدیوں تک اس رتبے کا انسان اس ملک میں پیدا نہ ہو سکے۔

بہادر انسان

بچو، تمھیں یہ سن کر حیرانی ہوگی کہ کچھ لوگ باپو کو دنیا کا سب سے بہادر انسان مانتے تھے۔ وہ موت سے بالکل نہیں ڈرتے تھے نہ انھیں روپے پیسے کا لالچ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ دنیا کی سب سے بڑی برائی خوف ہے انھوں نے ہندوستانیوں کو خوف سے بچے رہنے کا مشورہ دیا، ڈاکٹر خان صاحب نے جو بڑے جیالے پٹھان تھے ایک مرتبہ اخبار والوں کو بتایا:

> ''میں گاندھی جی کی عزت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ بہادر اور نڈر آدمی ہیں۔''

پٹھان لوگ اہنسا (عدم تشدد) کو سرے سے نہیں جانتے۔ ان کے لیے یہ ایک انوکھی بات ہے لیکن یہ باپو کا کرشمہ تھا کہ ان لوگوں کو بھی دھیرے دھیرے اہنسا کا سبق سکھا دیا۔ باپو کا یہ یقین تھا کہ اہنسا کہ مدد سے اس دنیا کا ہر کام چل سکتا ہے۔ اور ہنسا یعنی تشدد سے تو کسی بھی مسئلے کو سچے طریقے سے حل نہیں کیا جا سکتا۔

ساری دُنیا اُن کا خاندان تھی

باپو کا خاندان اُن کے اپنے گھر کے لوگ ہی نہ تھے، وہ تو ساری دنیا کو اپنا خاندان مانتے تھے۔ اُن کے بچے شاید یہ محسوس نہیں کرتے تھے باپو صرف ان کے ہی باپ نہیں بلکہ جگت پتا ہیں۔ جو لوگ ان کے آس پاس رہتے تھے، اُن کا وہ گھر والوں سے کہیں زیادہ خیال کرتے تھے۔ کیوں کہ اُن کی آتما مہان تھی یعنی وہ بڑی ہستی تھی۔

1946 میں گاندھی جی بنگال میں تھے۔ جب وہ کچھ مدت کے لیے آسام گئے تو ان کے آشرم میں ایک لڑکی بیمار ہوگئی۔ اسے بخار آنے لگا۔ ڈاکٹر ودھان چندر رائے کو اس کے علاج کے لیے بلایا گیا۔ اس طرح بیمار کی دیکھ بھال کا پورا انتظام کیا۔ انھیں دنوں باپو کے ایک بیٹے منی لال داس گاندھی افریقہ سے آئے تھے وہ بڑے بھولے بھالے اور صاف دل انسان تھے۔ انھیں اپنے باپ سے جو بھی شکایت ہوتی فوراً کھل کر کہہ دیتے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ معمولی سی بیماری میں اس لڑکی کی اتنی خاطر اور ایسی دیکھ بھال ہو رہی ہے تو انھوں نے باپو سے کہا:

''آپ نے اپنے پریوار کا تو کبھی اتنا خیال نہیں رکھا اور دوسروں کی اتنی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔''

شاید انھیں یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ ان کے باپ کتنی بڑی ہستی ہیں اور نہ یہ سمجھتے تھے کہ باپو کا کنبہ سارا سنسار ہے۔ انکی نظر میں تو اپنے پرائے کا کوئی بھید نہیں۔ لیکن منی لال گاندھی نے اپنے باپ پر یہ الزام بھی لگایا کہ

''جو لوگ باپو کے ساتھ رہتے ہیں ان کی زندگی بڑے مزے میں

گزرتی ہے۔''

گاندھی جی نے اس بات کا جواب دیا۔

''اگر میرے ساتھ رہنے سے لوگوں کو سکھ اور آرام ملتا تو میرے سب بیٹے مجھے چھوڑ کر دور نہ چلے گئے ہوتے۔''

حساب کتاب کے پکّے اور سچّے

اب ایک اور مزے دار بات سنیے، اس سے آپ اندازہ لگا سکیں گے کہ باپو حساب کتاب کے معاملے میں کتنے پکے اور سچے تھے اور ہمیشہ اصولوں کی پابندی کرتے تھے۔ 1946 میں جن دنوں کرپس مشن ہندوستان آیا ہوا تھا اس وقت باپو پونا میں تھے۔ سر اسٹیفورڈ کرپس اور سر پیتھک لارنس ان سے ملنے کے لیے بہت بے چین تھے کیونکہ وہی ہندوستان کی آواز تھے جو کچھ وہ کہتے تھے سارا ملک اسے مانتا تھا۔ سرکار کی طرف سے گاندھی جی اور اس کے ساتھیوں کو دلی لانے کے لیے ریل گاڑی کا انتظام کیا گیا۔ وہ گاڑی ان کے لیے جہاں جہاں سے گزرتی وہاں کے لوگ جمع ہو جاتے، گاڑی رُک جاتی، اور گاندھی جی کی جے کے نعروں سے فضا گونج اٹھی۔ جب گاڑی دلی پہنچی تو انھوں نے تیسرے درجے کا کرایہ یعنی تین روپے چودہ آنے وائسرائے کے پرائیوٹ سکریٹری کو بھجوا دیے۔ پرائیوٹ سکریٹری جارج ایول صاحب کو یہ بات عجیب سی لگی انھوں نے روپیہ لے کر آنے والے سدھیر گھوش سے جو روپے دینے کے لیے گئے تھے کہا کہ یہ بے کار بات ہے۔ میں کیا کوئی اسٹیشن ماسٹر ہوں۔ روپیہ کس نے مانگا ہے اس گاڑی کا انتظام تو سرکار کی طرف سے کیا گیا ہے۔

جب ان کو سمجھایا گیا کہ باپو کرایہ ادا کیے بغیر نہیں مانیں گے تو انھوں نے کہا ''اچھا اگر کرایہ ہی ادا کرنا ہے تو انھیں اسپیشل ٹرین کا کرایہ اٹھارہ ہزار روپیہ ادا کرنا ہوگا۔''

جب یہ بات گاندھی جی تک پہنچی تو انھوں نے جواب میں کہا:

''یہ اٹھارہ ہزار روپیہ کا مطالبہ غلط ہے کیوں کہ میں تو ہمیشہ تیسرے درجے میں سفر کرتا ہوں اور اسی کا کرایہ مجھے ادا کرنا ہے۔ میں نے اسپیشل ٹرین کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔ اب جو سرکار نے مہیا کی ہے تو اس کی بات وہ جانے۔''

اس طرح باپو نے اسپیشل ٹرین کا کرایہ ادا کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اور تیسرے درجے کا کرایہ ادا کرنے پڑتے رہے۔ بھلا ان کی بات کو کاٹنے کی کس میں ہمت تھی۔ صحیح کیا اور غلط کیا۔ یہ ان سے زیادہ کون جانتا تھا۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سکریٹری صاحب اس سلسلہ میں ضرور پریشان ہوگئے آخر تیسرے درجے کا کرایہ لیا اور اسے ریلوے بورڈ کے چیرمین کو بھیج دیا اس کا مطلب یہ نکلا کہ باپو کی ہر بات نرالی ہے۔

پیار ہی پیار

باپو بچوں سے بہت پیار کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی پرورش اچھی طرح کی جائے اور ان کی صحت درست رہے۔ انھیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ یہ بچے ہی آنے والے زمانے کا اُجالا اور طاقت ہیں۔ اگر انھوں نے اچھی طرح تعلیم حاصل نہ کی اور ان کی صحت اچھی نہ ہوئی تو دیس آگے کیسے بڑھے گا۔ اسی خیال سے

انھوں نے بچوں کے لیے بنیادی تعلیم کی اسکیم پیش کی۔ وہ چاہتے تھے بچوں کو پکی اور اچھی تعلیم دی جائے۔ وہ اچھی طرح پڑھیں اور سب کچھ جانیں۔ باپو سادھوؤں اور درویشوں کے سے خیالات رکھتے تھے۔ اسی لیے لوگ ان کو مہاتما کہتے تھے۔ وہ اپنے لیے نہیں دوسروں کے لیے جیتے تھے۔ ان کے بھید وہی جانیں۔

باپو ہر بات کو سمجھتے اور ڈھنگ سے سلجھانے کی کوشش کرتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کی بڑائی کا اندازہ ہوتا ہے۔

ایک بار سیواگرام میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہو رہی تھی۔ گاندھی جی کے سامنے قلم دوات رکھا تھا۔ اسی بیچ آشرم کے دو بچے کھیلتے کھیلتے وہاں آ گئے۔ اور آتے ہی قلم دوات اٹھالیا اور چل دیے۔ باپو نے انھیں ڈانٹا نہیں کیوں کہ ان کو غصہ تو کسی بات پر آتا ہی نہ تھا، وہ اٹھے اور انکے پیچھے چل دیے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان بچوں کو سمجھا بجھا کر قلم دوات لے لیں۔ اس میں ان کا خاصا وقت لگ گیا کمیٹی کے کئی ممبروں نے اس کو برا مانا اور سردار پٹیل نے باپو سے کہا:

''آپ نے ان بچوں کو ڈانٹا نہیں کہ انھوں نے ایک ضروری کام میں رکاوٹ کیوں ڈالی۔''

گاندھی جی نے جواب دیا:

''تم میری جگہ ہوتے تو ضرور ڈانٹتے بلکہ مار پیٹ بھی کرتے۔ میں ان کو کس طرح ڈانٹتا۔ آخر یہ ہم سے بھی بڑے بنیں گے۔''

کسی میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں رہی اور بات ٹل گئی۔

ماں باپ کا اثر

موہن داس کرم چند گاندھی 2/اکتوبر 1878 کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کی سویں سال گرہ بھی ساری دنیا میں منائی جا چکی ہے۔ ساری دنیا میں ان کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ لوگ برسوں ان کے خیالات کو سمجھنے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی کوشش کریں گے۔ جب وہ بچے تھے تو ان میں کوئی خاص بات نظر نہیں آتی تھی۔ وہ شرمیلے تھے، ان کی پیدائش پور بندر میں ہوئی تھی۔ ان کے تین بھائی تھے ایک بہن تھی۔ ان کے باپ کا نام کرم چند گاندھی تھا، ماں کا نام پتلی بائی۔ یہ لوگ ذات کے بنیے تھے لیکن ان کے خاندان کے لوگ حکومت کے عہدے دار تھے۔ گاندھی جی کے دادا پور بند کے دیوان تھے اور باپ پور بندر راج کوٹ اور بیکانیر ریاستوں کے دیوان رہے تھے۔

بعض بچے اپنے ماں باپ کا بہت اثر لیتے ہیں اور اس طرح ان کی زندگی ایک نیا موڑ اختیار کر لیتی ہے۔ یہی گاندھی جی کے ساتھ ہوا۔ یعنی ان پر ان کے باپ اور ماں کا بہت اثر ہوا، وہ دونوں سچائی کے ماننے والے تھے اور روپے اور جائداد بنانے میں ان کو کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ گاندھی جی نے اپنی زندگی کے حالات میں یہ بھی لکھا ہے کہ ان کی ماں بہت مذہبی خیالات رکھتی تھی۔

گاندھی جب بچے تھے تو ہر روز اپنی ماں کے ساتھ مندر جایا کرتے تھے۔ ساتھ ہی لکھنے پڑھنے سے ان کو بڑی دل چسپی تھی، دنیا اور زندگی کی دوسری باتوں سے وہ دور ہی رہتے تھے، وہ بچپن سے سچ بولنے کے عادی تھے اور جانتے تھے کہ ہمیشہ سچ ہی بولنا

چاہیے۔ انھوں نے اپنے ماں باپ سے یہ بھی سیکھا تھا کہ برائی کا بدلہ بھلائی سے دینا چاہیے۔ موہن داس کرم چند گاندھی کو ان کے باپ نے پڑھنے لکھنے میں بڑی مدد دی تھی۔ انھیں مذہبی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا، ان کی تحریر بہت بھدی تھی اور آخر تک ایسی ہی رہی۔

نقل کرنے سے انکار

گاندھی جی ابھی طالب علم ہی تھے کہ سچائی کو پرکھنے کی صلاحیت ان میں پیدا ہوگئی تھی۔ ایک بار انسپکٹر صاحب اسکول میں آئے۔ انھوں نے کچھ لفظوں کا املا لکھوایا سب نے ٹھیک لکھا، لیکن موہن داس کرم چند گاندھی ایک لفظ بھی نہ لکھ سکے۔ ان کے ٹیچر نے سوچا کہ اس طرح تو انسپکٹر صاحب کے سامنے میری بدنامی ہوگی۔ موقع پاکر گاندھی جی کے پاس بیٹھ گئے اور ایک لڑکے کی کاپی سے نقل کرنے کا اشارہ کیا لیکن گاندھی جی نے اسے مناسب نہ سمجھا اور انکار کردیا۔ وہ جانتے تھے کہ صحیح نہ لکھ سکنے پر ان کی بدنامی ہوگی اور ان کا مذاق اڑایا جائے گا لیکن انھوں نے دھوکا نہیں دیا۔ بعد میں ان کے ٹیچر نے انھیں ڈانٹا۔ اس سے انھیں بہت دکھ ہوا، لیکن یہ انھیں یقین تھا کہ انھوں نے ٹھیک کام کیا ہے۔

بچے وطن کی جان ہیں

گاندھی جی کا بیاہ تیرہ برس کی عمر میں ہوگیا تھا۔ ان کی بیوی کا نام تھا۔ کستوری بائی۔ وہ بھی انھیں کی عمر کی تھیں۔ انھوں نے تعلیم نہیں پائی تھی اس لیے لکھ پڑھ نہیں

سکتی تھیں لیکن تھیں بہت سمجھ دار۔ انھوں نے زندگی بھر گاندھی جی کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ان کے اصولوں کو اپنایا۔ ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ ایسے موقعے بھی آئے جب وہ اپنے شوہر کی رائے سے اتفاق نہیں کرتی تھیں لیکن وہ کبھی ان کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنیں بلکہ ہر بات میں ان کا ساتھ دینے کو وہ اپنا ایمان سمجھتی رہیں۔

گاندھی جی بچوں کا کتنا خیال رکھتے تھے اس کا اندازہ شاید بچے نہیں کر سکتے۔ لیکن وہ بچوں کو وطن کی جان سمجھتے تھے۔ 1930 میں گاندھی جی ڈانڈی مارچ شروع کرنے والے تھے۔ اس لیے بہت مصروف تھے۔ وہ جلد ہی ایک بڑی تحریک شروع کرنے والے تھے۔ لیکن اس سے پہلے وہ ایک خط لکھنا چاہتے تھے۔ یہ خط انھوں نے وائسرائے کے نام لکھا۔ اس خط میں تحریک شروع کرنے کا اعلان تھا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور خط لکھا۔ یہ خط کسی بڑے آدمی کے نام نہیں تھا بلکہ ایک ہری جن لڑکی کے نام تھا جو ان سے پانچ سو میل کی دوری پر تھی۔ باپو نے اسے لکھا:

''تمھاری انگلی میں چوٹ لگی تھی کیا تم اس پر آیوڈین لگا رہی ہو؟ یہ ضرور لگانا۔''

اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ بچوں سے کتنا پیار کرتے تھے اور ان کا کتنا خیال کرتے تھے۔ اس مصروفیت میں بھی وہ ایک بچی کی تکلیف کو نہیں بھلا سکے۔ اور کسی طرح اسے خط لکھ ہی دیا۔

روح کی صفائی کے لیے بھوک ہڑتال

باپو کو اس بات کا ہمیشہ دکھ رہتا تھا کہ لوگ ہر جنوں سے برا برتاؤ کرتے ہیں اور

ان کو سماج میں آسانیاں نہیں دیتے۔ ہرجنوں کو سہولتیں دلانے کے لیے انھوں نے جان کی بازی لگا دی۔ ایک رات انھیں ایسا لگا کہ کسی نے ان سے کہا:

''تمھیں برت رکھنا چاہیے۔''

اور دوسرے دن سے انھوں نے برت شروع کر دیا۔ شاید یہ ان کی آتما کی آواز تھی۔ وہ ان دنوں جیل میں تھے۔ ان کی صحت گرتی ہوئی دیکھ کر انگریز سرکار نے انھیں فوراً رہا کر دیا وہ باپو جیسے آدمی کو جیل میں مرنے نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ اتنی بڑی ذمہ داری نہیں لے سکتی تھی۔ کیوں کہ برطانوی سرکار جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔

لیکن ان کی یہ بھوک ہڑتال کسی پر دباؤ ڈالنے کے لیے نہیں تھی، وہ تو یہ قدم صرف اپنی روح کی صفائی کے لیے اٹھایا کرتے تھے۔ ان کا یہ برت تو ایک طرح کی عبادت تھا اور ان کے اس قدم کا جنتا پر بہت اثر پڑتا تھا۔ اس طرح کہ جو باپو چاہتے تھے لوگ ویسا ہی کرتے تھے۔ برت تو وہ رکھتے ہی رہتے تھے۔

گاندھی جی نے عمر بھر آزادی کے لیے لڑائی لڑی اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ انگریز سرکار سے نجات حاصل کرنا ہی کافی نہیں۔ جب تک بھوکے کو کھانا، ننگے کو کپڑا اور بے گھر کو رہنے کی جگہ نہ ملے اس وقت تک مکمل آزادی نہیں ہوگی۔ گاندھی جی تو دیش کو اندھے یقین کی غلامی سے بھی نجات دلانا چاہتے تھے۔ اور اس کے لیے انھوں نے ہمیشہ کوشش جاری رکھی۔

وہ صحیح بات کو مانتے تھے

باپو کسی بات کو منوانے کے لیے ضد نہیں کرتے تھے۔ ہاں بچوں کی خوشی کے لیے

تو وہ بہت سی باتیں کرتے تھے۔ یہ تو سب کو معلوم ہی ہے کہ باپو آشرم میں رہتے تھے۔ ایک بار سابرمتی آشرم میں انھوں نے کہا کہ کپڑے دھونے کے لیے صابن نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے غریب لوگ صابن سے کپڑے نہیں دھو سکتے تو دوسرے لوگ بھی کیوں دھوئیں؟ بچوں نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ ان کو تو صاف ستھرے کپڑے پہننے کا شوق تھا اور وہ صابن استعمال کرتے تھے۔ ایک لڑکا جس کا نام بال تھا ان لڑکوں کا لیڈر تھا۔ اس نے بچوں کی طرف سے باپو سے جا کر شکایت کی۔ باپو نے کہا:

”تمھیں صابن استعمال نہیں کرنا چاہیے جب گاؤں کے لوگ تھوڑے سوڈے سے کام چلا لیتے ہیں تو آشرم کے بچے تھوڑے سوڈے سے اپنے کپڑے کیوں نہ دھوئیں؟“

بال نے جواب میں کہا:

”ہمیں دوسروں کے گندے طریقے کو اپنانے کا مشورہ دے کر آپ بڑی غلطی کر رہے ہیں۔“

باپو بولے:

”جب آشرم کے دوسرے بچے شکایت نہیں کرتے تو تم کیوں شکایت کرتے ہو۔ ہاں اگر تم ستر لڑکوں کے دستخط اپنے مطالبے پر کروالاؤ، تو میں تمھاری بات مان لوں گا۔“

یہ سن کر بال سوچنے لگا کہ دستخط تو وہ کرالے گا لیکن اس پر بھی باپو اپنے کہے سے پھر گئے تو کیا ہوگا۔ اس لیے اس نے باپو سے اقرار لے لیا کہ اگر ستر دستخط حاصل

ہو گئے تو وہ بچوں کو صابن استعمال کرنے کی اجازت دے دیں گے۔ ایسا ہی ہوا کہ بال ستر بچوں کے دستخط کرا کے لے آیا اور باپو نے صابن استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ باپو صحیح بات ہمیشہ ہی مان لیتے تھے۔

بچوں کی مدد

ایک مرتبہ گاندھی جی کچھ دن آرام کرنے کے لیے مہابلیشور گئے۔ ان کے بیٹے دیوداس ان کے ساتھ تھے۔ کچھ لیڈر بھی وہاں موجود تھے۔ ایک دن دیوداس کا بیٹا حساب کا سوال کر رہا تھا، اسے کچھ دقت ہو رہی تھی۔ اس نے کئی لوگوں سے اس سوال کے حل کرنے میں مدد چاہی لیکن کسی نے بھی اس کی بات نہ سنی، ناامید ہو کر وہ باپو کے پاس گیا اور کہا:

''یہاں اتنے لوگ ہیں مگر کسی نے بھی میری مدد نہیں کی۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟''

گاندھی اس وقت کچھ لکھ رہے تھے پوتے کی بات سنی تو ایک دم قلم کاغذ ایک طرف رکھ دیا اور بولے:

''آؤ میرے بچے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ وہ بڑے لوگ بہت مصروف ہیں تم مجھے بتاؤ کیا پوچھنا اور کیا مدد لینا چاہتے ہو۔ اگر تم خود سوال نہ نکال سکے تو میں تمھارے سوال کا حل بتاؤں گا۔''

یہ سن کر بچہ خوش ہو گیا اور سوال بتائے اور انھوں نے حل کرنے شروع کر دیے اور سمجھنے میں اس کی پوری مدد کی۔ ذرا سوچو بچو، دنیا میں کتنے بڑے آدمی ایسے ہوں گے

جو بچوں کا اتنا خیال رکھتے ہوں؟

یہ دونوں کہانیاں ایم۔ ایس۔ کنم وار صاحب نے اپنی کتاب ''گاندھی اور بچے'' میں لکھی ہیں۔

چور گاندھی

ایک بار موہن داس گاندھی نے بچپن میں گھر سے سونے کا ایک ٹکڑا چرا لیا۔ لیکن اس برے کام پر فوراً ہی شرم اور دکھ نے انھیں گھیر لیا۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ بات اپنے پتا جی سے کہیں گے۔ اس کے لیے انھوں نے باپ کو ایک خط لکھا۔ اور اپنے چوری کا اقرار کر لیا۔ اس بات سے گاندھی کے پتا جی پر بہت اثر ہوا ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس دن کے بعد گاندھی کو سچ کہنے اور سچ بولنے کی دھن لگی گئی پھر تو زندگی بھر کبھی انھوں نے سچ کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

بات کے پکے

جب گاندھی جی پہلی بار انگلینڈ گئے تو وہاں ان کو کئی طرح کی الجھنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ گوشت کھانا تو وہ کبھی کا چھوڑ چکے تھے اور وہاں سبزی خوروں کا کھانا ملنا بہت مشکل تھا۔ اور جو ملتا بھی تھا تو بہت بے مزہ لیکن اس کو کسی طرح انھوں نے برداشت کیا۔ آخر بیرسٹری کا امتحان پاس کر کے وہ انگریزی لباس میں وطن لوٹے۔ بعد میں انھوں نے اس کا پہننا بالکل ترک کر دیا۔

ایک مرتبہ جب ان کا اڑیسہ جانا ہوا تو وہاں کی غریبی اور دکھ بھری زندگی کو دیکھ کر

ان کے دل پر گہری چوٹ لگی۔ اس علاقے کے لوگوں کے پاس نہ کھانے کو کچھ تھا نہ پہننے کو۔ ان کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ انھوں نے دھوتی کرتا پہننا بھی چھوڑ دیا۔ پہلے تو وہ پگڑی باندھتے تھے اس کو بھی اس خیال سے چھوڑ دیا کہ اس میں بہت کپڑا لگتا تھا۔

ایک بار ایک بچے نے بڑے بھولے پن سے ان سے پوچھا۔

''باپو، کیا آپ اتنے غریب ہیں کہ کرتا بھی نہیں پہن سکتے ؟''

باپو نے جواب دیا:

'' مجھے ایک کرتے کی ضرورت نہیں، کروڑوں کرتے چاہئیں کیوں کہ کروڑوں انسانوں کے پاس تن ڈھکنے کو کرتا نہیں ہے، جب میں نے اتنے لوگوں کو ننگا پایا تو سوچا کہ مجھے بھی کرتا پہننے کا کوئی حق نہیں۔''

مرتے مرتے بچے

جب گاندھی جی بیرسٹر بن کر ہندوستان لوٹے تو انھیں کچھ دن بعد دکنی افریقہ جانا پڑا۔ وہاں رہنے والے ہندوستانیوں کے ساتھ بہت زیادتی اور ناانصافی ہوتی ہی تھی۔ وہاں انھوں نے ستیہ گرہ کی بھٹی میں خود کو خوب تپایا۔

وہاں ہندوستانیوں سے کالے رنگ کی وجہ سے نفرت کی جاتی تھی۔ ریل میں وہ پہلے درجے میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ گاندھی جی کو بھی ایک بار اس توہین کو سہنا پڑا اور انھیں گاڑی سے اتار دیا گیا۔ اس کے بعد انھوں نے طرح طرح کی زیادتیاں اور سختیاں برداشت کیں ۔ ٰک بار تو وہاں کے گورے لوگوں نے گاندھی جی کو مار ہی ڈالنا چاہا تھا۔ لیکن وہ کسی طرح بچ گئے۔ لیکن وہ مایوس ہو کر گھر نہیں جا بیٹھے۔ انھوں نے

وہاں کے ہندوستانیوں کی مدد کی اور اس کے کئی سال بعد 1915 میں وہ ہندوستان لوٹے۔

یہاں آکر انھوں نے فوراً سیاست میں حصہ لیا، پہلے انھوں نے سارے ملک کا دورہ کیا۔ حالات کو سمجھا اور پھر سیاست کے میدان میں اترے۔

جب وہ جنوبی افریقہ سے وطن لوٹ رہے تھے تو وہاں کے ستائے ہوئے ہندوستانیوں نے انھیں روتے ہوئے رخصت کیا تھا وہ اس لیے روتے تھے کہ گاندھی جی ان کا آسرا تھے باپو نے ان لوگوں کی ہمت بڑھائی تھی، اس کہانی کو پوری طرح جاننے کے لیے بچوں کو بھی چاہیے کہ باپو نے جو اپنی زندگی کی کہانی آپ لکھی ہے اس کو پڑھیں۔ اسے دنیا کی بہت اچھی اور بڑی کتاب مانا جاتا ہے۔

بچوں کے ساتھ کھیل کود

میں بس وہی باتیں سنانا چاہتا ہوں جو بچوں کو پسند ہیں۔ گاندھی جی بچوں کے بہت قریب تھے۔ ان میں رہ کر وہ خوب ہنستے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ شریر بچے اکثر ان کے کندھوں پر چڑھ جاتے تھے ان کے کان پکڑتے اور کھینچتے تھے ان کو گھوڑا بنا کر ان کی سواری کرتے تھے، چکر لگواتے تھے۔ اس سے ان کو بڑی خوشی اور آرام ملتا تھا۔ جہاں بھی وہ جاتے وہاں کے بچوں سے وہ فوراً گھل مل جاتے، بچے بھی انھیں اپنا لیتے تھے۔ وہ ان کی چھڑی چھین لیتے اور بھاگ نکلتے باپو ہنستے، دوڑتے، ان کا پیچھا کرتے اور آخر پکڑ لیتے ان سے اپنی چھڑی واپس لیتے۔

جن بچوں کو ایسا سہانا موقع ملا ہے وہ بہت خوش نصیب ہیں۔، جناب ایس ایم

کنم دار نے اپنی کتاب ''گاندھی اور بچے'' میں کئی دل چسپ باتیں اور کہانیاں لکھی ہیں جو بچوں کو بہت اچھی لگیں گی۔

صفائی پسند باپو

باپو صفائی کی طرف بہت دھیان دیتے تھے، وہ ٹھاٹ باٹ کی پرواہ نہ کرتے لیکن چاہتے تھے کہ ہر آدمی صحت مند ہو۔

ایک بار شام کو وہ تفریح کرنے جا رہے تھے کہ راستے میں ان کی نظر ایک بچے پر پڑی اس کے کپڑے بہت میلے کچیلے تھے۔ باپو سے رہا نہ گیا۔ انھوں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا:

''جاؤ اس لڑکے سے میلے پھٹے کپڑے چھین کر لے آؤ کل اسے اچھی
حالت میں لوٹا دیے جائیں گے۔''

لیکن وہ ناکام لوٹا کیوں کہ وہ بچہ کسی طرح اپنے کپڑے دینے کو راضی نہ تھا۔ آخر اسے بہلا پھسلا کر اس سے اس کے میلے کپڑے حاصل کر لیے گئے اور دوسرے دن باپو پھر ادھر سیر کو نکلے تو کچھ کھادی کے کپڑے، صابن اور کچھ کھانے کی چیزیں ساتھ لیتے گئے وہ لڑکا دوسرے دن بھی اسی جگہ کھڑا تھا باپو اس کے پاس پہنچے، اسے پیار کیا اور کہا:

''میرے بچے، یہ سب چزیں لو، کل صابن سے نہا دھو کر صاف
کپڑے پہن کر آنا، کل تمھیں کھانے کو کچھ اور دیا جائے گا۔''

اس کے بعد تو جب بھی کبھی باپو ادھر سیر کو نکلتے اس بچے کو صاف ستھرے کپڑے پہنے کھڑا پاتے، وہ انھیں ادب سے نمستے کرتا۔

سچائی کی قدر

بچے باپو سے مل کر اوران کے پاس رہ کر بہت خوش ہوتے تھے کیوں کہ وہ ہمیشہ انھیں اچھی باتیں بتاتے اوراچھے طریقے سکھاتے تھے۔ ایک دن سیوا گرام کی ایک لڑکی کو کہیں سے روپیہ مل گیا، وہ اسے لیے دوڑتی ہوئی باپو کے پاس پہنچی۔ لیکن اس وقت وہ اپنی کٹیا میں آرام کررہے تھے اس لیے اسے باپو کے پاس جانے سے منع کر دیا گیا۔ وہ جانے ہی کو تھی کہ اچانک باپو کے کان میں بھی یہ بات پڑ گئی کہ لڑکی کو ادھر آنے سے روکا گیا ہے۔

انھوں نے پکار کر کہا۔

اس لڑکی کو اندر آنے دو؛

وہ آئی اور باپو کو روپیہ پیش کیا۔ انھوں نے بھی اس سے باتیں کیں اور لڑکی کی تعریف کی کہ تم نے اچھا کیا جو روپیہ لا کر مجھے دیا۔ اس کے بعد فوراً ہی آشرم کے منیجر کو بلوایا گیا اور اس روپے کو ہری جن فنڈ میں جمع کرنے کو دے دیا گیا۔

بدھو باپو

باپو بچوں کے ساتھ خود بچہ بن جاتے تھے اور انھی کی طرح برتاؤ کرتے تھے۔ ایک دن ایک بچے نے کتے کو دیکھ کر کہا ''ارے باپو' دیکھو کتے کے دم ہے، باپو نے جواب دیا ''ارے کتے کے دم ہے''! اور ایسے ہو گئے جیسے انھیں بڑی حیرت ہو، ذرا دیر بعد انھوں نے بچے سے پوچھا ''کیا تمھارے بھی دم ہے؟'' بچہ قہقہے مار کر ہنسا اور بولا''

ارے باپو تم اتنے بڑے اور بوڑھے ہو گئے ہو لیکن تمھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ آدمی کے دم نہیں ہوتی۔ آپ وقعی بڑے ''بدھو ہیں''۔ باپو اور دوسرے لوگ جو وہاں کھڑے تھے خوب ہنسے۔

پنسل کی تلاش

بچوں کے ساتھ تو باپو بچہ ہی بن جایا کرتے تھے یہاں تک کہ انھیں اپنے ہوش کی خبر نہ رہتی تھی۔ وہ کسی بھی بڑے کام میں مصروف ہوں، بچوں کو وہ کبھی نہیں بھولتے تھے اور یہ ان کا ایک انوکھا طریقہ تھا۔

بمبئی کے قیام کے زمانے میں ایک دن بڑے غور سے کچھ ڈھونڈ رہے تھے، آچاریہ کرپلانی اور کاکا صاحب کالیلکر نے یہ دیکھا تو پوچھا آپ کیا ڈھونڈ رہے ہیں۔

جواب ملا ''پنسل ڈھونڈ رہا ہوں۔''

کاکا نے کہا ''باپو اس وقت آپ میری پنسل استعمال کر لیجیے میں آپ کی پنسل بعد میں ڈھونڈوں گا۔'' باپو بولے ''کاکا تم سمجھتے کیوں نہیں۔ میں وہ پنسل کھونا نہیں چاہتا، مجھے وہ پنسل جی۔اے۔ نٹیشن کے چھوٹے لڑکے نے مدراس میں بڑی محبت کے ساتھ دی تھی، وہ دوڑا دوڑا میرے پاس پنسل دینے آیا تھا میں اسے کیسے کھودوں۔

اس کے بعد کاکا اور باپو دونوں اس چھوٹی پنسل کو ڈھونڈنے میں لگ گئے۔ اور جب وہ مل گئی تو باپو کو چین آیا۔ وہ پنسل ایک انچ سے زیادہ لمبی نہ تھی۔

یہ کہانی جناب آر کے پربھو اور سیوک بھوج راج نے اپنی کتاب باپو اور بچے میں لکھی ہے۔

تیاگی بچہ

باپو کسی بھی دان سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوتے تھے لیکن دان کے پیچھے جو جذبہ چھپا ہوتا ہے اس کی وہ قدر کرتے تھے۔

ایک بار جب وہ دکنی ہندوستان کا دورہ کر رہے تھے انھوں نے ایک جلسے میں لوگوں سے کچھ دان کا مطالبہ کیا تھا۔ حاضرین میں ایک لڑکی تھی جس کا نام کومدی تھا۔ وہ آگے بڑھی اور اپنے سونے کے کڑے اتار کر باپو کو دے دیے۔ اس سے گاندھی جی بہت خوش ہوئے آخر میں اس لڑکی نے اپنے گلے کی زنجیر بھی اتار کر انھیں دے دی۔ اس کے بعد اپنے کانوں کے بندے بھی اتارے اور باپو کے حوالے کر دیے۔ باپو کے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس لڑکی سے انھیں ہمت ملی،

انھوں نے اس لڑکی سے پوچھا۔

''کیا تم نے اپنے ماں باپ سے اس دان کی اجازت لے لی ہے؟''

لڑکی خاموش رہی لیکن اس کا باپ اپنی بیٹی کے اس کام سے بہت خوش ہوا تھا۔ یہ بات باپو کو بتا دی گئی۔ لڑکی نے اس دان کے بدلے ایک چیز مانگی۔ باپو کے آٹو گراف۔

باپو نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا جس کا مطلب یہ تھا:

''ان زیوروں سے کہیں زیادہ قیمتی اس بچی کا جذبۂ قربانی ہے۔''

لڑکی نے جب یہ پڑھا تو وہ بہت خوش ہوئی۔

غضب کا انسان

بچو،تم نے جان لیا ہوگا کہ باپو اپنے زمانے کے ایک انوکھے اور بڑے انسان تھے، اور یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ وہ آج تمھارے درمیان نہیں رہے لیکن جیسے جیسے تم ان کے بارے میں پڑھو گے، ان کی تصویر تمھارے سامنے آتی جائے گی۔ ان کی انسانیت دوستی اور شرافت کی داستانیں بھی سننے میں آئیں گی۔ انھوں نے اپنی سمجھ اور بہادری کی جو چھاپ دنیا پر لگائی تھی وہ بھی ابھرے گی۔ 30 جنوری 1948 کو جب دلی میں ناتھورام گوڈسے نے گولی سے انھیں شہید کردیا تھا اس وقت بھی انکے منہ سے ''ہے رام'' نکلا تھا۔ کیوں کہ وہ بھگوان پر ہمیشہ بھروسہ رکھتے تھے۔ اور ان کے دل میں اس گولی مارنے والے خلاف کوئی نفرت نہ ابھری، جب ان کی موت ہوئی تو کروڑوں لوگوں نے سوچا کہ ان کے کنبے کا ایک بڑا انسان ان سے جدا ہو گیا ہے۔ کیوں کہ ان لوگوں نے باپو کو دیکھا تھا اور ان کی باتیں سنی تھیں۔

باپو اپنے جسم کو چھوڑ کر چلے گئے لیکن وہ اصل میں امر ہیں۔ آنے والی نسلیں یہ سوچ کر حیران ہوں گی کہ دنیا میں باپو جیسا ایک غضب کا انسان بھی پیدا ہوا تھا۔

□□□

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

نوٹ: طلبہ واساتذہ کے لیے خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

نوعمری

مصنف: دیویکارنگاچاری

صفحات: 112

قیمت: -/30 روپے

اوڈیسیہ (سمندری لڑکا)

مصنف: انیتا سارن

صفحات: 96

قیمت: -/22 روپے

شاہی درخت

مصنف: اے۔کے۔ہری کمار

صفحات: 95

قیمت: -/27 روپے

آپریشن پولو

مصنف: اے۔کے۔ہری کمار

صفحات: 125

قیمت: -/35 روپے

عقل مند مچھیرا اور دوسرے ڈرامے

مرتب: م۔ندیم

صفحات: 46

قیمت: -/13 روپے

بکری دو گاؤں کھا گئی اور دوسرے ڈرامے

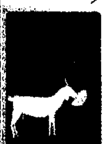

مرتب: م۔ندیم

صفحات: 78

قیمت: -/9 روپے

ISBN : 978-81-7587-324-7

कौमी काउन्सिल बराए फरोग़-ए-उर्दू ज़बान

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

National Council for Promotion of Urdu Language

West Block-I, R.K. Puram, New Delhi-110 066